

کالہ نہ زمانہ بکالہ کالہ

سرپرستی افتخار

پاکہ سوسائٹی کٹاٹ کلام

دل خیر کے لیے

کی اور آغا جی کی بے حد و حساب محبتیں ہی تو تھیں جو وہ ہر سال اپنی چھٹیوں میں اپنے نھیال کے بجائے اپنے دوھیال آنے کے لیے بے قرار رہتی تھی جسے اس کے دادا دادی کی وفات کے بعد بھی اس کے تایا زائر شاہ اور ان کی بیگم زہرت اسی محبت اور مان سے قائم کر رکھا تھا جیسے دا جی اور بے بی کی زندگی میں تھا۔

اپنے والدین کی وفات کے بعد زائر شاہ نے حقیقتاً اپنے چھوٹے بھائی عباس شاہ اور چھوٹی بہن عائشہ شاہ کے لیے ماں اور باپ دونوں کے منصب سنبھال لیے تھے اور بدلے میں دونوں بہن بھائی نے بھی ہمیشہ انہیں اسی عزت و تکریم سے نوازا تھا جس کے وہ

مستحق تھے۔ گو کہ گزرتے وقت نے ”شاہ ہاوس“ کی رونقوں میں پہلے عائشہ شاہ کی شادی اور عباس شاہ کی اسلام آباد میں نوکری۔ اور پھر دا جی اور بے بی کی وفات کی صورت خاصگی کر دی تھی مگر اس گھرانے کی محبتوں میں دن بدن اللہ کے فضل سے اضافہ ہی ہوا تھا جو آج کل کے مفاد پرست اور خود غرض دور میں ایک انہونی ہی تھی۔

دوسری طرف بزرگوں کی نیک نیتی سے پھیلائی ہوئی محبت اور عزت کی ان بیلوں نے اس خاندان کی نئی نسل کو بہت خلوص اور نرمی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ زائر شاہ کے تین بچے تھے۔ عین عمر اور مہراں عباس شاہ کی اکلوتی بیٹی دعا اور عائشہ شاہ کا بیٹا احمر اور بیٹی تانیہ میں اس قدر پیار اور یگانگت تھی کہ ان سے پہلی مرتبہ ملنے والے کو اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ کون کس کا حقیقی بہن بھائی ہے۔

”دعا بیٹا! یہاں اکیلی کیا کر رہی ہو؟“ زہرت بیگم نے بچن کی کھڑکی سے لان میں تنہا اور اس بیٹھی دعا کو دیکھا تو بے اختیار اس کے پاس آتے ہوئے گویا ہوئی۔

”کچھ نہیں مائی امی! بس یوں ہی۔“ غیر محسوس انداز سے اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بات بنانے کی کوشش کی تو زہرت بیگم اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئیں۔ بھکی پلکوں اور رندھی ہوئی آواز نے ایک لمحے میں انہیں ان کے سوال کا جواب دے

ناولٹ

دیا تھا مگر اسے اس دکھ کی کیفیت سے فی الحال نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ انجان بن جائیں اور یہی انہوں نے کیا۔

”بیٹا! جب کچھ نہیں کر رہیں تو چلو سب کے ساتھ اندر چل کر بیٹھو اور ویسے بھی اب مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ اکیلے باہر بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔“ پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے انہوں نے آخر میں ذرا عیب سے کہا تو وہ ان کی محبت پہ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

مائی امی کے ساتھ خاموشی سے اندر آتے ہوئے وہ بے اختیار ان کی نرم اور مہمان شخصیت کو سوچے گئی۔ وہ اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی اس قدر مشفق اور رخصت رہی تھیں کہ اسے کبھی ان میں یا اپنی مہمان گوئی فرق محسوس ہی نہیں ہوا تھا اور یہ ان

پراس کی ممان اور پاپا کی کار کا الیکٹرانٹ ہو گیا۔ عادیہ آتا شدید تھا کہ دونوں موقع پر بنی موت کی گود میں جا سوسے اس بات کا خیال کیے بنا کہ ان کے بعد ان کی لاڈلی کا کیا ہو گا۔

چند لمحوں کا کھیل تھا اور اس کی خوشیوں سے بھرئی زندگی تھے لق و دن صحرا میں تبدیل ہو گئی۔ قدرت کی ستم ظریفی نے اسے ایک جھٹکے میں آسمان سے زمین پر پٹختے ہوئے آن واحد میں ماں کی ممتا کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت سے بھی محروم کر دیا تھا۔ دکھ تکلیف اور بے یقینی نے اسے جیسے نڈھال کر ڈالا اور اس کے اس نڈھال وجود کو اگر کہیں سکون میسر تھا تو وہ بھی۔ مائی امی کی نرم اور مہربان آغوش۔

عباس شاہ اور مریم عباس کی موت کے بعد زائر شاہ اسے اپنے ساتھ کراچی لے آئے تھے مگر وہ تو لگتا تھا جیسے اپنا آب، اپنی جنمی، اپنے جینے کی امنگ سب کچھ وہیں چھوڑ آئی تھی۔ ہر حال چاند کی طرح چمکتا چنورا اور کلیوں کی طرح چمکتے لب اپنی ساری رعنائی اور ہر کسی کے چمکے تھے۔

ہر کوئی ہمہ وقت اس کی دلجوئی میں مصروف نظر آتا، جس کے نتیجے میں وہ اب ست روی سے ہی سہی مگر ہر حال زندگی کی جانب لوٹ رہی تھی اور وہ عاکی ذات کی یہ مثبت تبدیلی "شاہ ہاؤس" کے کینون کے لیے باعث سکون اور اطمینان تھی۔



"دعا براؤنیز تیار ہوئیں یا ابھی کسر ہے؟" شین نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کافی تیار کرنی دعا سے پوچھا تو وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"بس پانچ منٹ اور۔۔۔ بلکہ تم یہ کالی کو دیکھو، میں ذرا انہیں چیک کر ہی لوں۔" دعا کھن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اون کی جانب بڑھی۔

"طس۔۔۔ اچھا ہوا جو میں نے انہیں پانچ منٹ پہلے ہی دیکھ لیا۔" چھری ہاتھ سے رکھتے ہوئے اس نے رے باہر نکالی تو شین مسکراتے ہوئے ذرا اترا کر گویا

خاندان کے بچوں میں چونکہ "مہران شاہ" سب سے بڑا تھا لہذا اسے ایک خاص مقام حاصل تھا جس کی بدولت اس کا اپنے بہن بھائی اور دیگر تمام کزنز پر خاصا رعب تھا۔ طبیعتاً "بھی وہ خاصا سنجیدہ، کم گو اور بڑبڑا تھا۔ اس کا لیا دیا انداز تھا جو اس کی شاندار پر سنائی کو ایک عجیب سا وقار اور تمکنت عطا کرتا۔ یہ نہ تھا کہ وہ ان سب سے پیار نہیں کرتا تھا بلکہ وہ تو شاید ان سب کو بڑے ہونے کے ناتے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ ہاں مگر اظہار کے معاملے میں وہ خاصا کجس تھا اور ویسے بھی وہ بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان پیار میں بھی ایک لحاظ کا قائل تھا اور اپنی ان ہی عادات کے باعث وہ ایک جرنیشن میں "مغفور" اور بڑوں میں "سمجھ دار" مشہور تھا۔

خاندان میں مہران کے بعد اگر کسی بچے کو بے حدود حساب چاہا گیا تھا تو وہ بھی عباس شاہ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی "دعا عباس" جو اپنے والدین کی شادی کے پانچ سال بعد بہت منتوں اور ہرزادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی مگر اتنے لاڈ پیار کے باوجود وہ بہت سنجھی ہوئی اور بااخلاق بچی تھی۔ اس کی صورت اور سیرت دونوں ہی اس قدر لاجواب تھیں کہ گھبرالوں کے ساتھ ساتھ وہ نوکر دل تک کو۔۔۔ عزیز بھی۔

زائر شاہ اور زہرت بیگم کی تو گویا اس کا بچ ہی نازک گڑیا میں جان تھی اور وہ خود بھی اپنے ممانا سے زیادہ اپنے آقا بچی اور مائی امی کی دیوالی تھی۔ عید بقیع عید کے علاوہ ہر سال چھٹیوں میں وہ ان کے پاس کراچی دوڑی چلی آئی جس پر اسے اپنے نصیال والوں کی طرف سے بے اعتنائی کے خاصے شکوے سننے پڑتے مگر وہ کیا کرتی اس محبت کا جو اسے "شاہ ہاؤس" کے کینون سے تھی جو اس قدر بے لوث اور پر زور تھی کہ ان کے بغیر اسے کہیں چمکن ہی نہ آتا تھا۔

اور اس ہی محبت کے زیر اثر اس سال بھی وہ اپنے ام لے الگش کے امتحانات سے فراغت کے بعد ہمیشہ کی طرح کراچی جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جب ایک رات راولپنڈی میں شہولی کی تقریب سے واپسی

”واہ دعا آئی! آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ اتنی غضب کی براؤنیز بنائی ہیں کہ ”سواد“ آیا۔“ میر نے تیسری براؤنلی اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی تعریف کی۔

”عمر جی! میرے خیال میں بیٹ تمہارا اپنا سب سو ذرا ہاتھ ”ہولا“ رکھو میرے سنبے کیونکہ پھر درد بھی تمہیں ہی ہوگا۔“ تالی ای نے اسے مسکراتے ہوئے نوکاتو سب کی ہنسی چھوٹ گئی جس میں سب سے اونچی آواز خود عمر صاحب ہی کی تھی جو کہ خدا کے فضل سے خاصے ذہین واقع ہوئے تھے۔

یونہی اوڑھار ادرہ کی باتیں کرتے ہوئے وہ سب برسے خوشگوار ماحول میں کافی بی رہے تھے جب پورنج میں رکنے والی بلیک سوک نے ان سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

”لو اچھا ہوا عمران بھی آیا۔ بس اک اس ہی کی کمی تھی ہماری محفل میں۔“ گاڑی ہلاک کر کے لان کی طرف آتے عمران شاہ کو دیکھتے ہوئے اتفاقاً گویا ہوئے تو سب کی نظر سب بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں جو ہاتھ میں بریف کیس اٹھائے ایش کرے نوچیں میں

ہوئی۔“ سے نہ ہنس ٹوی۔ کیونکہ میری وجہ سے تمہاری محبت ضائع ہونے سے بچ گئی۔“

”مختصر نہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اگر آج آپ وقت پر نہ آتیں تو نجانے مجھ غریب کا کتنا بڑا نقصان ہو جاتا۔“

خین کی اتر اٹھ پے بے ساختہ ہنستے ہوئے اس نے جواب دیا تو دعا کی ہنسی پختین کے تیزی سے چلتے ہاتھ محرم ٹھہرے آج کتنے دنوں بعد اس نے دعا کی بے ساختہ ہنسی سنی تھی۔ بے اختیار وہ اس کی طرف گھوم گئی اور چند لمحے اسے تکتے کے بعد آگے بڑھتے ہوئے گلے سے لگا لیا۔

”میں خوش ہستی رہا کرو دعا۔ تمہیں شاید اندازہ ہی نہیں کہ تمہاری یہ ہنسی ہم سب کو کس قدر عزیز ہے۔“

اور محبت کے اس پر خلوص اظہار پر دعا کی آنکھیں لہجوں میں نمکین دانی سے بھر گئیں۔ اپنے غم میں کھو کر وہ اپنے پیاروں کو کس قدر تکلیف دے رہی تھی اس کا اندازہ صحیح معنوں میں اسے اس بل ہو رہا تھا۔ جو

محببتیں وہ گنوا چکی تھی انہیں تو دوبارہ حاصل کرنے پر وہ تھوڑے ہی۔ ہاں مگر محبتوں کے جو گراں قدر خزانے لب اس کی ذات کے گرد اجالا گئے ہوئے تھے انہیں وہ کبھی کبھو نے نہیں دے گی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے اس نے خود سے وعدہ کیا تو ایک اطمینان روح کی گمراہیوں تک سرایت کرتا محسوس

ہو۔

”چھا چلو اب باہر چلتے ہیں کیونکہ کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے اور سب ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔“ خود کو زمین سے الگ کرتے ہوئے اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹرے میں چیزیں رکھنے لگی۔

ساتھ ساتھ چلتی ہوئی وہ دونوں جب لان میں پہنچیں تو عمر سمیت اتفاقاً اور تالی ای کو بھی اپنا منظر

پایا۔

شکستہ معجزہ کے مرتبہ کردہ

”غاقون کا دسترخوان اور کون دسترخوان“

خصوصیت: زمین، قلعہ اور کے ساتھ پہلے بلدیہ میں

کون کے مکانات

پائیزکھانے

قیمت / 150 روپے

ڈاک خرچ / 16 روپے

مستکانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 نور محمد بازار کراچی

چہرے پر حکمن کے بان خود نہایت ڈھنڈنگ اور اسارت لگ رہا تھا۔

”اسلام علیکم“ سب کو سلام کرتا ہوا وہ نزدیک کر سی پر گر سائیا تو سلام کا جواب دیتی تالی ای اس کا تھا ہوا چہرہ کیجہ کن بیٹھ کی طرح بے قرار ہو گئیں۔
 ”بیٹھا؟ نہیں خود کو اتنا تھا کاتے ہو۔ ذرا صحت دیکھو اپنی تس قدر کمزور ہو رہے ہو۔ آخر پہلے بھی تو یہ بزنس چلتی تھی۔“

”واؤ نہایت تیکس آہ کا بھی جواب نہیں۔ بیٹے کی چاروں طرف کی گفتگوں پہ آپ کیسے پریشان ہوا اسی ہیں اور ہر جو جوانی سے یہ معانی تک کام کرتے کرتے مذہل ہو گئے۔“
 ”مجھے آپ کو ہماری حکمن اور صحت کا تو خیال نہ آیا۔“
 ”مراں کے کچھ کمنے سے پہلے آغا جی بنے مسکراتے ہوئے تالی ای سے گلہ کیا تو ان کی شکایت پہ سب کے یوں مسکراہٹ ہو گئی۔“

”واقعی ایہ دس ازمات تیسرے۔ آپ نے اس معاملے میں ہمارے آغا جی کے ساتھ بہت نا انصافی کی ہے۔“
 ”مراں نے جیتے ہوئے باپ کا ساتھ دیا۔“

”جی میں تو چہرہ ہوتی ہے نا۔ اب میں بھلا ان کے لیے ممتا کمن سے لاؤں۔“
 ”تالی ای اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے گویا ہو کمن تو ان کی بات پہ ایک ذیہست قہقہہ بڑا اور اس کے جیتے مسکراتے مراں کی جانب بے خیالی میں دیکھتی دعا کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک عجیب سا احساس ہوا ایک ایسا احساس جس نے چند سیکنڈ کے لیے اسے سوائے مراں کی بذات کے اور گرد کی ہر چیز سے غافل کر دیا۔“

”جیتے مراں کو کھلی بنا کر دانا۔ اور مراں تم کلنی کے ساتھ یہ پرتو تیز بھی ضرور ٹرائی کرنا۔ دعا نے خود نکلی ہیں۔“

”مورہ بہت سی زندگی نکلی ہے۔“
 ”عمر نے تالی ای کی بات کاٹتے ہوئے تھرا لگایا تو وہ دعا کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔“

”اگر واقعی دعا نے بیٹائی ہے تو بہت اچھی بات ہے کمن کی نکل میں صرف کلنی لولہ لگا۔“ اور دعا کو نجانے

کیوں مراں کی یہ تعریف ضرور سنی کی تعریف محسوس ہوئی۔ ایسے جیسے کوئی فرض پورا کیا گیا ہو جبکہ دوسری طرف شہین اس کے احساسات سے بے خبر مراں سے اپنی ہی منوانے پر مصر تھی۔

”بھائی! آپ ٹرائی تو کر کے دیکھیں، اتنی محنت سے دعا نے بنائی ہے۔ آئی ایم شیور کہ آپ کو ضرور پسند آئیں گی۔“

”پلیز شہین ڈیڑھا ابھی نہیں اور دیکھو میں کمرے میں جا رہا ہوں، میری کالی وہیں لے آنا۔“
 شہین کو قطعیت سے منع کرتے ہوئے وہ نئی ہدایت جاری کرنا ہوا بے نیازی سے اپنا برف کیس اٹھائے اندر کی جانب چل رہا تو دعا اس مشغور انسان کو دیکھ کر وہ کئی جسے کسی کا دل بھی رکھنا نہیں آتا تھا۔



”آج ”شاہ ہاؤس“ میں معمول سے بڑھ کر رونق تھی۔ وجہ ایک توہفتہ وار تعطیل اور دوسری تانیہ اور احمدی علی الصبح آمد تھی جس کے باعث گھر میں آج خاصا ہنگامہ بپا تھا۔“

صبح سویرے احمد اور تانیہ کی آمد کے بعد سب نے نہایت خوشگوار ماحول میں حلوہ پوزی کا بھرپور ناشتا کرتے ہوئے خوب رونق لگائی اور ناشتے سے فارغ ہو کر ان بانیچوں نے لان میں کرکٹ کھیلتے ہوئے وہ شور مچایا کہ کان بڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ دعا نے آج نجانے کتنے دن بعد دل کھول کر قہقہے لگاتے ہوئے خوب انجوائے کیا تھا اور اسے خوش دیکھ کر ان چاروں سمیت آغا جی اور تالی ای بھی نہایت خوش اور مطمئن ہو چلے تھے۔

اگلے دو گھنٹے لان میں خوب ہنگامہ مچانے کے بعد وہ سب اب لاؤنج میں بیٹھے اسکو اٹس پیتے ہوئے اپنی توانائیاں بحال کرنے کے ساتھ ساتھ خوب زور و شور سے گفتگو میں بھی مصروف تھے۔ جب اچانک کسی بات پر احمد نے دعا کی چٹنی چٹنی تو بے ساختہ ایک دلہنوز کی کے ساتھ وہ اپنے پیل چمڑاتے ہوئے اس پر کھینچو

کے ساتھ حملہ آور ہو گئی، جبکہ باقی سب بیٹے ہوئے ان دونوں کو "بک اپ" کرنے لگے اور میں اسی لمحے جب لاؤنج میں پہنچا، تب تک اپنے عروج پر تھا، غصے سے مجھ سے ہر طرف تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر ان سب کے سر پر آپٹیا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کچھ تمیز بھی ہے تم لوگوں کو یا نہیں؟ اندر کمرے میں میرا فریڈ آیا ہوا ہے اور تم لوگوں نے اس قدر شور مچا رکھا ہے کہ بات کرنا محال ہو گیا ہے اور دعائے یہ تم ابھی کس خوشی میں چینی تھیں؟" اس کی گرجدار آواز پہ یک دم ان سب کو ساٹھ سوٹھ گیا۔ احمر کے ساتھ ساتھ سب ہی سنبھل کر سوڈ ہو بیٹھے جبکہ لاؤنج کے بیچوں بیچ ہاتھ میں کٹن لٹے کھڑی دعوتوں کا رخ اپنی جانب مڑا دیکھ کر بے اختیار ہراساں ہو گئی۔

"دعوت میں۔۔۔ مران بھلا۔۔۔ بھائی۔۔۔ میرے بال۔۔۔" اس کی غصے سے کھورتی لٹا ہوں کو خود پہ مرکوز آیا تو وہی سسی بہت بھی جواب دے گئی۔ زبان اس قدر لڑکھرائی کہ بات کرنا مشکل ہو گیا جبکہ اس کی حواس باختگی پہ ان سب کی "کھی کھی" شروع ہو چکی تھی۔ "خاسوس ہو جاؤ تم سب۔۔۔" مران کی دھاڑ پر ایک بار پھر کمرے میں سنانا چھا گیا۔

"اور دعائے یو آر ناٹ اگنڈ" آئندہ اس طرح کی فضول حرکت کرنے سے پہلے زرا اپنی عمر دیکھ لیا۔ اپنی بات عمل کرتے ہی وہ جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے پلٹ کر لاؤنج سے باہر نکل گیا جبکہ دوسری طرف دعائی کا ٹوٹو بدن میں لہو نہیں والی کیفیت تھی۔ اس قدر تذلیل وہ بھی سب کے سامنے۔ لحوں میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، جنہیں سر جھکاتے ہوئے بڑی مشکل سے اس نے بننے سے روکا۔

"دعا۔۔۔ آر یو آل رائٹ؟" نہیں اور تانیہ مران کے نکلنے ہی تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ کمرے میں موجود تمام افراد کو ہی مران کے روڈنڈا زپر بے اختیار افسوس ہوا۔

ایک خطبہ سے لڑکے کے کہانی

ایک خطبہ
سے لڑکے
کے کہانی

اسی
دیوانی
سی

میں قسط وار چھپا اور بے حد مقبول ہوا، آج بھی ہر لڑکی ہر خاتون یہ تاول پڑھنا چاہتی ہے

اب کتابی صورت میں چھپ کر آیا ہے

مجلد، خوبصورت سرورق، قیمت 400 روپے

خواتین ڈائجسٹ

اردو بازار کراچی

میلنے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ ایڈوبازار کراچی

لاہور، ایکڈمی، 55-56 سرگودھا

پتہ: اردو بازار، لاہور

خیال ہی نہیں رہا کہ کل بارہ تارخ ہے۔
 "اس اوکے بیٹا! اب تم جلاؤ اور جلدی سے ناشتا
 کر کے میرے پاس آؤ۔"
 "جی، بس میں یوں گئی اور یوں آئی۔" دعائے چنگلی
 بجاتے ہوئے کماؤ انہوں نے فوراً اسے ٹوک ڈالا۔

"کوئی ضرورت نہیں، یوں جانے اور یوں آنے
 کی۔ تسلی سے ناشتا کر کے آؤ۔ ذرا اپنی صحت دیکھو،
 دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی ہو۔"

"نہیں، اتنی تو موٹی ہو گئی ہوں گھر میں بیٹھے بیٹھے۔"
 ان کے ٹوکنے پر وہ مسکرا کر بولی تو اس کی مبالغہ آرائی پہ
 تلی امی اسے گھور کر دیکھنے لگیں۔

"بیٹا! چونکہ مجھے تم کہیں سے بھی ہوئی نہیں
 لگتیں، سو جان! جیسا کہ رہی ہوں ویسا ہی کرو۔" اور
 دعا ان کے متاثرے حکم پہ بے ساختہ ہنستی ہوئی پکن
 کی جانب چل دی۔



آج بہت عرصے کے بعد "شاہ ہاؤس" میں کسی
 تقریب کا انعقاد ہوا تھا۔ سوسب کچھ بہت — اچھا
 لگ رہا تھا۔ سچے بے ہنستے مسکراتے چہرے اس
 خوبصورت منظر کو جیسے چار چاند لگا رہے تھے۔ حالانکہ
 صرف خاندان کے افراد چند رشتہ دار اور کچھ قریبی
 دوست ہی تھے مگر پھر بھی اچھی خاصی رونق ہو گئی
 تھی۔

دعا جس وقت تیار ہو کر باہر لان میں آئی، تقریباً
 سب ہی مہمان اچکے تھے جن کے درمیان عمر نہایت
 بن ٹھن کر اور آکر کر بیٹھا ہوا تھا۔ دعا کی نظر حسب اس پہ
 بڑی تو اس کے — شاہانہ انداز و اطوار پہ بلا ارادہ ہی
 ایک دلچسپ مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔
 دوسری طرف عمر نے جو اسے یوں مسکراتے دیکھا تو
 سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

"کیا بات ہے دعا اپنی! آج تو آپ بڑی اچھی لگ
 رہی ہیں۔ ہائے داوے یہ وہی وہی مسکراہٹ
 ہونٹوں پر سجا کر کس پہ بجلیاں گرانے کا ارادہ ہے؟"

خواب ہو گئی ہو کیونکہ تم مجھے کل شام سے ہی تھکی
 تھکی لگ رہی تھیں۔ ویسے طبیعت تو ٹھیک ہے
 تمہاری؟" دعا منہ ہاتھ دھو کر لاؤنج میں آئی تو تالی امی
 نے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے تشویش سے
 پوچھا۔

"جی تالی امی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تب بس
 پریشان نہ ہوا کریں۔" دعا ان کی محبت بھری تشویش پر
 خود کو فریش پوز کرتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجھا
 کر ان کا کھل چوتھے ہوئے بولی تو وہ بے اختیار اسے خود
 میں سموتے ہوئے گویا ہو گئی۔

"ارے کیسے نہ پریشان ہوا کروں تم اپنا خیال بھی تو
 منظر پر رکھتیں۔ اب بھی دیکھو آنکھیں کیسی سو گئی ہوئی
 ہیں۔ کہیں تم رات بھر روئی تو نہیں رہیں؟" اس کا چہرہ
 اپنے سامنے کرتے ہوئے ایک بار پھر وہ تشویش بھری
 نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگیں تو وہ بے اختیار گھبرا
 اٹھی۔

"منہ نہیں میں بھلا کیوں روو گی تالی امی!
 آج شاید میں معمول سے زیادہ سوئی ہوں، اسی وجہ سے
 آنکھیں سو گئی ہوں گی۔" پل میں خود کو سنبھالتے
 ہوئے اس نے غیر محسوس انداز میں ان کی طرف سے
 پیچ موڑتے ہوئے جواب دیا تو وہ جیسے مطمئن سی
 ہو گئی۔

"چھاتر پہلے جا کر ناشتا کر پھر میرے پاس آنا۔"
 "کیوں، کوئی کام ہے تالی امی؟" ان کے پرہیزگار
 انداز پہ وہ ان کی طرف ملتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں بیٹا! کل کی تقریب کے سلسلے میں مہمانوں کو
 فون کر کے فراٹ کرنا ہے۔"

"کل کی تقریب؟" بے دھیانی میں اس نے
 پوچھا تو تالی امی حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیوں بیٹا! بھول گئیں کیا۔ عمر کی ایجنڈنگ کی
 سینٹلے کی خوشی میں تمہارے اتالی نے جو ڈنر ایجنڈ
 کیا ہے وہ کل ہی تو ہے۔" نرمی سے انہوں نے اسے
 یاد دہانی کروائی تو وہ بے اختیار شرمندہ ہو گئی۔

"مہمہ وہ تقریب۔ آئی ایم سوری تالی امی! مجھے

”کم از کم تم پر تو ہرگز نہیں۔“ دعائے شرارت سے جو لب دیا تو وہ ایک ادا سے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک ٹھنڈی آدھ بھر کر بولا۔

”ہائے... کاش میں آپ سے بڑا ہوتا۔ قسم سے آپ نے دنیا میں پہلے اگر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔“
”جو قسمت“ دعائے پستے ہوئے اسے ایک دھبہ رسیدی۔

”چھاپہ بٹاؤ کہ شین کہاں ہے؟“ اس نے ارد گرد نظر دوڑاتے ہوئے عمر سے پوچھا تو وہ انگلی سے وسیع لان کے دوسری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
”وہ وہاں ٹیبل کے پاس مس نیرو فاروق کے ساتھ کھڑی ہیں۔“

”یہ مس نیرو فاروق کون ہیں بھی؟“ دعائے اس کی نشاندہی پر دور کھڑی شین کے ساتھ موجود لڑکی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تمہاری دوست کی بیٹی ہیں۔ بہت ہی ڈسٹ اور پیکٹیکل قسم کی خاتون ہیں۔ اپنے فلور کا تقریباً سارا بڑنس آج کل انہوں نے ہی سنبھل رکھا ہے۔“
عمر نے عادت کے مطابق پوری تفصیل اس کے گوش گزار کی تو دعار بہت کمر کے کپڑوں میں لبوس اس لڑکی کو ستاسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”دیری امپر نیو۔ میرے خیال میں ان سے ضرور ملنا چاہیے۔“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے آبی! جبکہ میرے خیال میں مجھے ”ان“ سے ضرور ملنا چاہیے۔“ عمر اپنے ہال سیٹ کرتا ہوا ایک کیوٹ سی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا تو دعا ایک نظر اس لڑکی پر لور دو سری آگے بڑھتے عمر پر ڈال کر ہنستے ہوئے شین کی جانب چل دی۔

”اسلام علیکم؟“ شین اور نیرو کے قریب پہنچنے پر دعائے سلام کرتے ہوئے دونوں کو متوجہ کیا تو شین اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

”دعا... یو آر لکنگ بیوٹی فل۔“
”تھینک یو۔“ دعائے شین کی بے ساختہ تعریف

یہ بلش ہوتے ہوئے کہا تو نیرو اس کے گلابی پڑتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے بولی۔
”واقعی آپ تو سادگی میں بھی غضب ڈھاری ہیں۔“

”تھینک یو۔ لیکن آپ بھی سمجھ کم حسین نہیں لگ رہیں۔“ دعائے مسکراتے ہوئے جواباً نیرو کی تعریف کی تو وہ کھل کر ہنس دی۔

”میرے خیال میں اس پوری محفل میں تمہیں وہ واحد خواتین ہو جو ایک دو سرت کی منہ پر تعریف کر رہی ہو اور وہ بھی بغیر کسی جان پہچان کے۔“ شین نے مسکراتے ہوئے دونوں کو سراہا تو دعائیں کر بولی۔

”تو پھر دو ٹیک نیت لڑکیوں کو تمہیں نہیں اٹرو ڈیوس کیوں نہیں کورائیں۔“

”مشیور ڈا بے ٹائٹ۔ نیرو! یہ ہیں میری بہت عزیز کزن دعا اور دعا! یہ ہیں تمہاری کے بہت اچھے دوست! انکل فاروق کی بیٹی نیرو۔“

”تا کس نو میٹ یو دعا۔“ نیرو نے دعا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے بھی مسکرا کر اس کا ہاتھ تمام لیا۔

”سیم ہشو۔ ویسے آپ کتنی کیا ہیں؟“ دعا کے پوچھنے پر نیرو اسے اتنے تارے میں تفصیل سے بتانے لگی اور پوری ادھر ادھر کی جگہ پر ہنسی کرتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں وہ دونوں ایک دوسرے سے خاصی بے تکلف ہو گئیں۔

کھانا لگنے پہ وہ تینوں اپنی اپنی پلیٹیں لیے ایک ہی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی کھانے میں مصروف تھیں جب اچانک ممران کے مخصوص کلوں کی مسکندہ آواز نے ارد گرد محسوس ہوئی۔ بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے جونہی اس نے سر اٹھایا، نظر سیدھی نیرو کے قریب کھڑے ممران پر پڑی جس کا شاندار سر پابلیک سونگ میں اس قدر رخ رہا تھا کہ ایک لمحے کو تو دعا آنکھیں جھپکنا بھول گئی جبکہ دوسری طرف ممران اس کی کیفیت سے بے نیاز مسکراتے ہوئے نیرو سے محو گفتگو تھا۔ ممران کی کسی بات پہ نیرو نے بے ساختہ ہلکا

ساتھ لگایا تو دعا جو پہلے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ چکی تھی، دونوں کے مسکراتے چہروں کو ایک نلک دیکھنے لگی۔ نارسائی کا ایک عجیب روح کو چیرتا ہوا احساس اسے اپنے اندر تک اترتا محسوس ہوا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اور لمحوں میں اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ یہ سوچ کہ مران کے نزدیک اس کے علاوہ ہر کوئی اہم ہے اس طرح سے اس پر حاوی ہوئی کہ وہ ہر مصلحت کو بھلا بیٹھی۔ حتیٰ کہ پاس بیٹھی ٹھین بھی اسے ان لمحوں میں یاد نہ رہی۔



تقریب کے اختتام پر چند ایک کام نبھانے کے بعد جب دعا اور ٹھین اپنے کمرے میں آئیں تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے مگر ٹھین کے باوجود ٹھین دونوں کی آنکھوں سے غائب تھی۔ یونہی چند لمحے خاموشی سے گزرے تو ٹھین جو نجانے کب سے بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی، دعا کو بلا ارادہ بکار بیٹھی۔

”دعا!“

”ہوں!“ اپنے ہی دھیان میں گم دعا نے بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا تو ٹھین کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”دعا! ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“

”تمہا سزا تو نہیں کرو گی؟“

”ہلے کبھی تمہاری کسی بات کو ماننا کیا ہے جو آج کروں گی۔“ ٹھین کے عجیب سے انداز میں دعا نے لب کے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ٹھین کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جو اسے چونکا گئی۔

”دعا۔ تم۔ تم مران بھائی کو پسند کرتی ہونا؟“ ٹھین نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو دعا کو محسوس ہوا جیسے کوئی ہم ٹھین نے اس کے سر پہ دے مارا ہو۔

اپنی ذات کی اس درجہ کمزوری، بے بسی کے احساس اور ٹھین کے استفسار نے اسے لمحوں میں اس قدر

بے حال کر ڈالا کہ وہ فق چہرے کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی چلی گئی۔

”دعا۔۔۔ پلیز خود کو سنبھالو۔ دیکھو میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ تم یہ پانی پیو۔“ ٹھین نے اس کی حالت کے پیش نظر گھبرا کر تیزی سے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے اسے تھمایا تو وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی۔

”دعا۔۔۔ تم اتنے کمزور اعصاب کی مالک تو کبھی نہ تھیں۔“ ٹھین نے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو ایک سخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ بے امانی اور بے سائبانی کس طرح انسان کو بریل بنا دیتی ہے۔ کوئی دعا عباس سے پوچھتا۔

”کسی کو چاہتا اور وہ بھی پورے خلوص، نیک نیتی اور بھائی کے ساتھ کوئی جرم تو نہیں جو تم یوں خود کو گناہ گار سمجھتے ہوئے شرمندہ ہو رہی ہو۔“ نری سے اس کے بال سنوارتے ہوئے ٹھین نے اس کی بہت بندھائی تو بے اختیار اس کے آنسو بہ نکلے، جنہیں ٹھین نے بڑی محبت سے اپنی انگلیوں پر چن لیا۔

”خبردار! جو لب تم رو میں۔ ویسے یار! ایک بات تو بتاؤ، تمہیں پوری دنیا میں یہ بلا کو خان کے جانشین ہی ملے تھے محبت کرنے کو۔“ لبوں پر مسکراہٹ لیے وہ اب کے شرارت سے گویا ہوئی تو دعا روتے روتے ہنس دی۔

”دعا! ویسے ایک بات تو ماننی پڑے گی۔ تم نے ہم سب کی ایک بہت بڑی مشکل آسان کر دی ہے۔“ اسے ریلیکس ہوتا دیکھ کر ٹھین نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو دعا اس کا چہرہ نکلنے لگی۔

”وہ یہ ڈیرا کہ لب ہمیں ”بھابھی“ کی تلاش میں مارا مارا نہیں پھرتا پڑے گا کیونکہ ایک چاند کا نکلا آل ریڈی ہمارے گھر میں موجود ہے۔“ ٹھین نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے تو دعا کا چہرہ کانوں کی لوہوں تک سرخ ہو گیا جسے اس نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

”ٹھین!“

”ہوں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں۔۔۔“

”کہ تم مہران بھائی کو پسند کرتی ہو۔ ارے محترمہ!

آج آپ جس طرح ہر طرف سے بے نیاز ہو کر مہران بھائی اور نیرہ کو دیکھ رہی تھیں، میں تو کیا کسی عقل کے اندر سے کو بھی یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔“ ہنستے ہوئے عین نے اس کی ابھمن دور کی تو بے اختیار دعا کی نظموں کے سامنے تھوڑی دیر پیشتر کا وہ منظر اور اپنی دو گوں حالت گھوم گئی۔ دکھ کے احساس کے زیر اثر اس کے مسکراتے لب یک لخت پھر سے ایک دوسرے میں پوست ہو گئے تو عین جیسے لکھوں میں اس کی کیفیت جان گئی۔

”دعا! ڈونٹ وری ایٹ آل۔۔۔ تم اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو، میں موقع ملتے ہی ای سے بات کرتی ہوں۔ ایڈ آئی تو کہ میری بات سب کو بہت پسند آئے گی۔“ بات کے اختتام پہ عین نے اسے گلے لگا لیا تو دعا خوشی سے گنگ ہو گئی۔

”اور اس سے پہلے کہ عین نہت بیگم سے کچھ کہتی، ایک دن دعا کی غیر موجودگی میں وہ خود ہی مہران کی شادی کا موضوع چھیڑ بیٹھیں۔“

”مہران بیٹا! تمہارا نیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”آجھی ہے سو اور پریشانی سی۔“

”مہروں اور اگر میں پوچھوں کہ دعا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے تو۔۔۔؟“ انہوں نے پرسوج انداز میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔

”دعا کے بارے میں۔۔۔ کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”آرے بابا میں شادی کے پوائنٹ آف ویو سے پوچھ رہی ہوں۔“ اس کی نا عجیبی پہ ہنستے ہوئے انہوں نے اپنا مطلب بیان کیا تو لکھوں میں اس کے مسکراتے لب سڑ گئے، جبکہ دوسری طرف پوری طرح مہران کی طرف متوجہ عین کا دل بھائی کے سڑتے لبوں کے

ساتھ ہی پوری قوت سے سڑ کر پھیلا تھا۔

”آئی! اگر آپ کے دل میں ایسا کوئی بھی خیال ہے تو پلیز اسے نکال دیجیے۔“ پوری سنجیدگی سے اس نے آن دھند میں کمرے میں موجود دونوں نفوس کے دلوں میں روشن امید کی شمع کو اپنے ایک ہی جھلملا والا توڑا سے دلچہ کر کے نہیں۔

”کیوں بیٹا! دعا میں آخر کس چیز کی کمی ہے جو تمہ۔۔۔ نہت بیگم نے دگر فکری سے پوچھا چاہا تو مہران ان کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا۔

”بات کمی کی نہیں ای! بات میری پسند و ناپسند کی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ دعا کے ساتھ میری سیشنل انڈر اسٹینڈنگ ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی جیسی لا بلف پارٹنر میں چاہتا ہوں، دعا اس ایج پر پوری نہیں آتی۔“

”تو کیا تم کسی کو پسند کرتے ہو؟“ اس کی بات سنتے ہوئے نہت بیگم نے اپنے تئیں نتیجہ اخذ کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”آئی! دعا کو اس لحاظ سے ناپسند کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔“

”پوچھا تو پھر نیرہ۔“ اس لحاظ سے کیسی ہے؟“ انہوں نے ناراضگی سے ”اس لحاظ“ پر زور دیتے ہوئے پوچھا تو وہ خالی لب میل پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جیسے آپ بہتر سمجھیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ آئی بات عمل کرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب چل دیا تو عین نے جو اتنی دیر سے خاموش تماشاخیابی بیٹھی تھی، اٹھ کر نہت بیگم کے پاس چلی آئی۔

”آئی! آپ بریشن مت ہوں میں مہران بھائی سے خود بات کر کے انہیں منانے کی کوشش کرتی ہوں۔ آخر دعا میں کس چیز کی کمی ہے جو وہ انکار کر رہے ہیں۔“

”بیٹا! وہ کہہ ڈیا ہے کہ دعا میں کوئی کمی نہیں محو اسے اس لحاظ سے پسند نہیں۔“ کرا دکھ لہجے میں

سوئے وہ تھک کر گویا ہوئیں تو شیمن ان کا ہاتھ تھام کر
 لہجہ سے بولی۔
 ”ہی! آپ مجھے بات تو کرنے دیں۔ کیا پتا وہ مان
 جائیں اور دیکھیں پلیز نمبر و کاؤ کر بھی آپنی اٹال رہنے

”پلیز بھائی! آپ نہیں تو مت۔“ شیمن اپنی تخت
 مٹانے کو بولی تو مران اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔
 ”کو کے نہیں ہستا۔ تم کہو جو کہتا ہے۔“
 ”ہیلے آپ وعدہ کریں کہ آپ ہانڈ نہیں کریں
 گے۔“

”کیسے رہنے دوں جی! بات میرے ہاتھ میں نہیں
 تمہارے اتنا جی کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے ہی مجھے
 دونوں پروپوز لڑیہ مران کا عندیہ لینے کو کہا تھا۔ وہ اس
 سال کے انڈر انڈر اس کی شادی سے فراغت چاہتے
 ہیں۔“ وہ بے بسی سے بولیں تو شیمن ایک گہری سانس
 لے کر رہ گئی۔ ماں کی پوزیشن اور پریشانی کا اندازہ اسے با
 خوبی ہو گیا تھا۔

”نہیں کروں گا بابا۔“ وہ ابن کی پھیلی ہتھیلی پر اپنا
 ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوا تو شیمن چند لمحوں کی خاموشی
 کے بعد اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”بھائی! آپ آپ دھا کا پروپوزل رجسٹر
 مست کریں۔“

”چھا آپ ایسا کریں کہ اس مسئلے پر اتنا جی سے
 کوئی بات نہ کریں۔ میں آج رات ہی بھائی سے اس
 موضوع پر بات کرتی ہوں۔“ انہیں سمجھاتے ہوئے
 آخر میں وہ فیملہ کن انداز میں بولی تو زہرت بیگم محض
 سر ہلا کر رہ گئیں۔

”شیمن! میرے خیال میں اس موضوع پر مزید بات
 کرنا بے کار ہے۔“ اس کی بات کے جواب میں پوری
 سنجیدگی سے کہا گیا تو شیمن بھائی کا چہرہ دکھ کر رہ گئی۔
 پہلا جملہ ہی اس قدر حوصلہ شکن تھا کہ کتنے ہی لمحے
 اسے اپنی ہمت جمع کرنے میں لگ گئے۔
 ”کیوں؟ کیوں بے کار ہے بھائی۔ آپ کہتے ہیں
 کہ یہ ہم سب کی بولی ترنا ہے کہ دعا آپ کی شریک سفر
 بنے۔“



”انکسکیوزی بھائی! کیا آپ فارغ ہیں؟“
 دروازے پر دستک دیتے ہوئے شیمن نے کمرے میں
 داخل ہوتے ہوئے پوچھا تو بیڈ پر نیم دراز مران ہاتھ
 میں چکری کتب ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔
 ”ہوں، آؤ شیمن! بیٹھو۔“

”میں جانتا ہوں تم۔“
 ”مگر شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ دعا آپ میں
 انٹرنل ہے۔“ تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے
 شیمن نے ایک نیا انکشاف کیا تو مران کو گویا سناپ
 سو گئے گئے، مگر اگلے ہی بل غیظ و غضب سے اس کا چہرہ
 سرخ ہو گیا۔

”تھینک یو۔ ویسے کون سی کتاب بڑھ رہے تھے
 آپ؟“ بیڈ پر بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے اس نے ہاتھ
 بڑھا کر اس بڑی کتب اٹھالی تو وہ جیسے سے مسکرایا۔
 ”شیمن ڈیرے جوابات کرنے آئی ہو وہ کرو۔“
 ”بات۔“ مجھے تو کوئی بات نہیں کرنی بھائی! ہم گریڈ
 کا اس نے کتاب رکھتے ہوئے مصحوبیت سے کہا تو وہ
 شرارت سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”آریوشیور سوئی!“

”سٹ اپ شیمن! تمہیں پتا ہے کہ تم کیا کہ رہی
 ہو۔“ ایک دم بیڈ سے کھڑے ہوتے ہوئے وہ دھاڑا تو
 اپنے کمرے سے نکلتی دعا بے اختیار مران کی تواز پر
 تیزی سے اس کے کمرے کی جانب لپکی مگر اس سے
 پہلے کہ وہ دروازے پر دستک دیتی، اندر سے آئی شیمن
 کی آواز نے اس کا ہاتھ بلند ہونے سے پہلے ہی روک
 دیا۔

”آگ۔ ٹوبہ“ جھینپتے ہوئے کہا گیا تو مران کا
 تقہر بے اختیار گونج اٹھا۔

”مجھے تو معلوم ہے بھائی کہ میں کیا کہ رہی ہوں مگر
 شاید آپ کو نہیں پتا کہ آپ دعا اور ہم سب کے ساتھ
 کتنی بڑی زیادتی کرتے جا رہے ہیں۔“ شیمن کے من

سے اپنا نام سننے ہی باہر کھڑی دعا کو یہ جاننے میں مھل
 ایک لمحہ ہی لگا کہ اندر کون سا موضوع زیر بحث ہے تا
 چاہتے ہوئے بھی تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ
 وہیں دروازے سے کپاس کھڑی ہو گئی۔
 ”انف از انف۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی اور کہا تو
 میں ابھی اور اسی وقت دعا۔“

اور تدریج کے ان جان لیوا لمحات میں روتے
 تر پتے برستی آنکھوں اور ٹوٹے دل کے ساتھ دعا
 عباس نے زندگی میں پہلی بار خود اپنی ذات سے کوئی
 عہد کیا اور وہ عہد تھا مرتے دم تک مہران شاہ سے
 نفرت کرنے اور اسے کبھی بھی معاف نہ کرنے کا۔



”بھائی! آپ دعا کو کچھ نہیں کہیں گے۔“ عین
 نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تو وہ جیسے مزید بھڑک
 اٹھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے بیٹا! دعا کو آنکھیں کھولنا
 دیکھ کر مائی امی نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے
 ہوئے پوچھا تو وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔
 ”مجھے کچھ کیا ہوا ہے مائی امی!“ اس نے خشک
 لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پریشانی سے پوچھا تو وہ اس
 کی گھبراہٹ دیکھتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں
 بولیں۔

”کیوں؟ کیوں نہیں کہوں گا بلکہ اس کی تو میں ایسی
 طبیعت صاف کروں گا کہ سارا عشق و عاشقی کا خناس
 دماغ سے نکل جائے گا۔“

”کچھ بھی تو نہیں میری جان!“
 ”تو یہ میں آپ کے کمرے میں کیا کر رہی ہوں۔“
 اس نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پھر سے سوال
 کیا۔

”بھائی! آپ دعا کے جذبات کی تو بہن کر رہے ہیں“
 اب کے عین نے بھی غصے سے اسے ٹوکا تو وہ شہرے
 ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔

”ہو نہ ہو تو بہن۔ تو تمہارا کیا مطلب ہے کہ
 میں اس تھڑا کلاس بیروئن کی ان عامیانہ باتوں کو
 سلوٹس مارتا ہوں۔“

”آل۔ آل۔ لیٹی رجوس۔“ وہ اسے ٹوکتے
 ہوئے عباس پر داغدار میٹر اٹھانے لگیں تو وہ جیسے چڑ گئی۔
 ”مائی امی! آپ بتاتی کیوں نہیں کہ مجھے کیا ہوا
 ہے۔“

اور باہر کھڑی دعا میں اس سے زیادہ سننے کی نہ طاقت
 تھی اور نہ ہمت۔ اپنے آئینے جیسے نازک اور پاکیزہ
 جذبات کی اس سے زیادہ تدریج وہ برداشت نہ کر سکتی
 تھی۔ سو زار و قطار روتے اور اپنی سسکیوں کا گلا
 گھونٹتے وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچی جہاں
 داخل ہوتے ہی اس کا خود پر سے اختیار اٹھ گیا۔

”بیٹا! بہت تیز بخار رہا ہے تمہیں پرسوں رات
 سے۔“ وہ نرمی سے گویا ہو میں تو وہ حیرانی سے اس کا
 چہرہ دیکھنے لگی۔

دل کی دنیا آباد ہونے سے پہلے ہی اس بے دردی
 سے اجاڑ دی گئی تھی کہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ روح
 تک لوہا بن ہو گئی تھی۔ مہران نے لمحوں میں بہت
 سفاکی سے اس کے اولین خوابوں، معصوم ارمانوں اور
 سب سے بڑھ کر اس کے پر خلوص جذبات کا خون کیا
 تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے ہر لحاظ
 سے زیاں کا احساس اس قدر شدید تھا کہ اسے اپنے
 دماغ کی رکیں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں دل اپنے
 خدا سے اس وقت اور صرف اور صرف موت کا طلب گار
 تھا۔

”پرسوں رات سے؟ مگر مجھے تو ہوتا نہیں چلا۔“
 ”بیٹا! تم ہوش میں ہو قی تو کچھ پتا چلا۔ بخار اتنا
 شدید تھا کہ تم سارا وقت بے سدھ بڑی رہیں۔ آج
 کہیں جا کر ٹیپو کچرا کم ہوا ہے تو تم نے آنکھیں کھولی
 ہیں۔“ آخر میں انہوں نے جبکہ کر اس کی پیشانی چوم
 لی تو وہ انہیں ابھی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی مگر اس
 سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھتی کمرے کا دروازہ کھول کر
 عین امجد داخل ہوئی اور عین پر نظر ڈالنے ہی اس کے
 ذہن کے خلی پر وہے پر اس درد مہری رات کا ہر لذت

”وہا! میرا بھائی بہت بد نصیب ہے جو تمہاری محبت کی قدر نہ کر سکا۔ تم دو گناہوں کا ایک دن اپنے لیے برکت بنا چھتائے گا۔“ شین گہرے دکھ کا احساس لیے بولی تو مہران کے ذکر پر دعا جیسے جی گہرہ گئی۔

”پلیز شین! مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی دوبارہ اس موضوع پر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوگی۔ پلیز۔“

دعا نے التجائیہ انداز میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے تو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

دعا کی صحت یابی کے بعد جو منی، نائی امی نے آغا جی تک مہران کا فیصلہ پہنچایا۔ اس سے اگلے ہی دن نائی امی اور چھپو کے ساتھ باقاعدہ مہران کا رشتہ لے کر فاروق ہمدانی کے گھر جا پہنچے، جنہوں نے رسماً بھی سوچنے کا وقت نہ مانگا اور یوں اسی شام دونوں کا رشتہ اور ساتھ ہی منگنی کی بات بھی طے کر دی گئی۔

دعا کو جب شین کے ذریعے مہران کی منگنی طے پا جانے کی خبر ملی تو مکمل غصے سے اس نے آنکھوں میں آنی نمی کو اپنے اندر اتارتے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر سب گھر والوں کو مبارک باد دی اور خوشیوں کے سیلاب میں مہران شاہ نے نیمہ فاروق کی مخروطی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی۔ اسی گلابی شام کی تاریک اور اداں رات میں دعا عباس نے چھت کی شمالی میں آخری بار اپنی زندگی کی اولین محبت کا جی بھر کے ماتم کیا تھا۔ اس شب اس نے اپنے ہاتھوں اپنے ہراس جذبے کا گلا بیٹھ کے لیے گھونٹ ڈالا، جس کا تعلق مہران شاہ کی ذات سے تھا اور یوں اپنے دل کی سرسبز زمین کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑتے اور پیرا د کرتے اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی یہ وہی جانتی تھی اور اب اس تکلیف اور اذیت کو اسے ہمیشہ یاد رکھنا تھا۔ یہ دعا عباس کا خود سے کیا گیا وہ سراسر امد تھا۔



وقت ست روی سے ہی سہی مگر گزر رہا تھا اور اس

ناک لہو چہرے روشن ہو گیا۔ دکھ اور تکلیف کے احساس کے ذریعہ اس نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں، جبکہ دوسری طرف اس کی حالت سے بے خبر نئی امی، شین سے اس کی کنڈیشن ڈسکنس کرنے کے بعد بس اب چند ایک ہدایات دے رہی تھیں۔

”متم اب دعا کے پاس بیٹھو تاکہ میں اس کے لیے جوس لے آؤں اور ساتھ ہی تمہارے آغا جی کو بھی فون کر کے صدمتے کے بکرے کا کمرہ دوں۔“ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں تو شین خاموشی سے اس کے پاس آئی منی اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”وہا! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“

”ٹھیک ہوں۔“ بند آنکھوں سے اس نے جواب دیا تو شین ان کے مہرے چہرے کو بخور دیکھنے لگی۔ اس رات شدید غم کے عالم میں جب وہ مہران کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی تھی تو کمرے کے وسط میں بے ہوش دعا نے جہاں اس کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے وہیں اسے اس بات کا بھی اشارہ دے ڈالا تھا کہ دعا کی اس حالت کی ذمہ دار ان دونوں بھائی بہن کے مابین ہونے والی گفتگو ہے اور یہ خیال کہ کہیں دعا نے ان دونوں کی باتیں سن نہ لی ہوں۔ خود اس کے لیے سوہان امد تھا۔

ابھی بھی وہ دعا پر نظر میں جمائے اسی پارے میں سوچ رہی تھی جب کہ منگنی سے اس نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے شین کو دکھا اور آنسوؤں میں ڈوبی ان آنکھوں نے اسے اندر تک چیر ڈالا۔ لمحے کے ہزاروں جھمکے میں اس کا شک یقین میں بدل گیا۔

”وہا! تڑپ کر شین اس کے گلے لگ گئی تو وہ ایک بار پھر بکھر کر رو دی۔

”پلیز وہا! بڑی مشکلوں سے تمہاری طبیعت سنبھلی ہے تم یوں رو کر خدا را خود کو بڑھال نہ کرو۔“ اس کی حالت کے پیش نظر شین نے اگلے ہی بل خود کو سنبھالتے ہوئے دعا کے آنسو اپنی پوروں سے صاف کیے اور سارا دے کر اسے سنبھالتے ہوئے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

ہوئی۔

”میرے خیال میں بھائی! آپ اپنی گاڑی میں نیرو کو لیتے ہوئے ہو مل پہنچ جائیں جبکہ ہم سب احمر کے ساتھ اس کی کار میں ڈائریکٹ ہو مل پہنچنے کی کرتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے، ہم وہاں تمہاری ریزرو کی ہوئی ٹیکسلی پر تمہارا انتظار کریں گے۔“ احمر نے شیمن کی تجویز کو سراہتے ہوئے پروگرام ڈن کیا تو مہران ”لو کے“ کہتا ہوا سب کے ساتھ باہر پورچ میں چلا آیا۔

نیرو کی ہمراہی میں مہران شاہ جب ہو مل پہنچا تو ان سب کو اپنا ہتھکرایا۔

”وہ سلام علیکم بھائی! احمر اور عمر نے نیرو کو شرارت سے دیکھتے ہوئے کنا تو مہران کے ساتھ بیاتھ نیرو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ڈالنی۔ چونکہ مکتبی کے بعد نیرو سے یہ ان سب کی پہلی مشترکہ ملاقات تھی، سو سب کی شوخیاں عروج پر تھیں۔

”وہ علیکم السلام کیسے ہیں آپ دونوں؟“ کرسی سنبھالتے ہوئے جواباً ”وہ ان کا حال احوال دریافت کرنے لگی۔

”اور دعا! تم سناؤ کیسی ہو؟“ خاموشی سے نظریں جھکا کر بیٹھی دعا نے نیرو کی آواز پر چونکی پلکیں ڈٹھائیں، نظریں ہی سامنے بیٹھے مہران شاہ کی نظر سے جا کھرائی جو بہت غور سے اس کے تاثرات جانچنے میں مصروف تھا۔

”میں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بھائی! آپ سنا میں؟“ اگلے ہی لمحے گہری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے اس نے قصداً ”نیرو کی بجائے بھائی کہا تو ساتھ بیٹھی شیمن اسے دیکھ کر کہنے لگی جبکہ مہران کا چہرہ ناقابل فہم تاثرات سے سج گیا۔

”آئی ایم فائن ٹوب۔ ہائے دادے یو آر کنکم گریٹ ان میروں کلر۔“

”شی گس گریٹ ان ایوری کلرز۔“ درندہ نظروں سے احمر نے دعا کا جائزہ لیتے ہوئے نیرو کے کھنٹ کے جواب میں کہا تو یوں سب کے سامنے تعریف پر دعا بے

گزرے تو وقت کے ساتھ دعا نے بھی خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ ویسے بھی جس مہران شاہ سے اس نے خاموش محبت کی تھی وہ تو کوئی اور تھا جبکہ جو مہران ”شاہ ہاؤس“ کا مکین تھا وہ تو نیرو فاروق کا منگیترا تھا اور چونکہ نیرو فاروق کے منگیترا کا ہونا نہ ہونا اس کے لیے برابر تھا، سو زندگی بغیر کسی نئی الجھن کے اپنی پرانی ڈگر پر ہی رواں دواں تھی۔ ویسے بھی جب جذبات بے موت مر جائیں اور زندگی سے بھر پور دل ناسخ کسی کی بے اعتنائی اور نفرت کی آگ میں جھلس کر لوق و لوق صحرا میں تبدیل ہو جائے تو ہر احساس از خود مر جاتا ہے اور احساسات کی یہ موت کبھی کبھی انسان کے لیے بڑی فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

وہ بے حسی ہے شکست دل سے منبر کوئی پھنڈ کر چلا جائے تو غم نہیں ہوتا بس کچھ بھی حال اب دعا عباس کا ہو چلا تھا اور اس کی اس روش نے جبیں ایک طرف اس کی عزت پندار اور انا کو مہران شاہ کے سامنے بکھرنے سے بچایا تھا، وہیں دوسری طرف شیمن کی نظروں میں اس کے جوصلے، ہمت، مہم اور اعلا طلبی کا مقام بلند کر ڈالا تھا۔

اور آج جبکہ مہران شاہ، نیرو کے ہمراہ ساری رنگ بارہلی کے بے حد اصرار پر انہیں اپنی مکتبی کی ”ٹریٹ“ کے طور پر بی بی سی میں ڈن کر ڈالنے لے جا رہا تھا تو شیمن کو اس بات کا پکا یقین تھا کہ دعا ان کے ساتھ ہرگز نہیں جائے گی مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دعا میروں گلر کے کائن کے سوٹ میں نہایت سادگی سے تیار ہو کر لاؤنج میں پہنچی۔ بظاہر ٹانگ سی یہ لڑکی کس قدر مضبوط اعصاب کی مالک تھی، اس بات کا اندازہ صحیح معنوں میں شیمن کو اس لمحے ہو رہا تھا۔

”چلیں۔۔۔ مہران ریسٹ وایچ پہننا ہوا ان پانچوں کے قریب پہنچا تو احمر گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا۔

”مہران۔۔۔ نیرو کا کیا پروگرام ہے؟“

”ہم ہو مل جاتے ہوئے اسے راستے میں پک کر لیں گے۔“ جب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے وہ بولا تو شیمن ایک نظر خاموش بیٹھی دعا پر ڈالتے ہوئے

سانت پیش ہوتے ہوئے امر کو گھورنے لگی اور ہل کی مدد ہم روٹھیوں میں دعا مہاں کا جینینا جینینا سایہ دلکش روپ ایک کعبے کو ہی سہی لیکن سدا کے بے نیاز اور مغرور مران شلو کی ساری توجہ سارا ارتکاز اپنی جانب مہذب کر گیا۔

یونہی ہلکی پھلکی جھٹکی جھٹکی کے دوران خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے وہ سب خوب انجوائے کر رہے تھے جب اچانک نیو کی نظر ایک ٹیبل پر بیٹھے چند مرد حضرات پر پڑی۔

”ہکسکو زوی ہو ری ہٹی۔ میں ابھی آئی۔“ وہ سب سے ہکسکو زکرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب چل دی تو ٹیبل پر موجود تمام افراد نے ایک بل کے لیے کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھی نیو کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے کندھے اچکا دیے جبکہ مران کی نگاہیں نیو پر ہی مرکوز رہیں جو اب نہایت خوش اخلاقی سے بیٹھے ہوئے ٹیبل پر موجود حضرات سے جو گفتگو تھی۔

”کون تھے یہ لوگ؟“ تقریباً دس منٹ کے بعد نیو نے کرسی واپس سنبھالی تو مران نے بے باثر لہجے میں پوچھنا سوائے نیو کے سب ہی کو اس کے موڈ کے آف ہو جانے کا اندازہ ہو چلا تھا۔

”یہ بلا کے بہت اچھے فرینڈز ہیں اور ان سے ہمارے کئی اچھے برنس ریز بھی ہیں۔ کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو تم بھی چل کر ان سے مل لیو۔“ نیو مران کے لہجے پر غور کیے بغیر کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بے نیازی سے بولی تو اس کے شہانہ انداز پر امر شرارت سے کھنکھارنے لگا۔

”نیو! میں برنس کے حوالے سے جان پہچان رکھنے والوں کو اپنی پرسنل لائف لوراچی فیملی سے دور رکھنا پسند کرتا ہوں۔ لیڈا جو آرٹا رٹ آف سالی فیملی جو سوئی کیرنفل فیکسٹ نامہ۔“ نیو کی طرف دیکھے بنا مران نے نہایت سنجیدگی سے اپنی بات کھل کی تو وہ اپنی ساری بے نیازی بھول بھول کر حیرانی سے اس کا چہرے دیکھنے لگی۔ مران اسے یوں سب کے سامنے ٹوک

دے گا اس بات کا تو اس نے ٹکنا بھی نہ کیا تھا۔
”تکر مران! میں تو۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے کچھ کستا چاہا تو مران نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جیسے بات ختم کر دی۔

”آپ دونوں اگر کھانے سے فارغ ہو چکے ہوں تو ڈیزرٹ آرڈر کریں؟“ ٹیبل نے ماحول کی کشیدگی دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بات بدلی تو مران نے ایک کرسی سانس لیتے ہوئے خود پر قابو پایا۔

”میرے خیال میں ڈیزرٹ نیو کی پسند سے منگوائی جائے۔ کیوں نیو؟“ اگلے ہی بل مران نے بلکے پھٹکے انداز میں کہتے ہوئے آخر میں نیو سے تائید چاہی تو وہ ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے خاموشی سے مینو کارڈ کی جانب متوجہ ہو گئی جبکہ مقابل رہنمی دعا مران کی اس فصاحت پسندی پر اپنی ہی سے مسکرا دی۔
نجانے کیوں لیکن اس لمحے اسے اس مران شلو کی شدت سے باز آ رہی تھی جو کبھی کسی کا دل بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔



برنس کے سلسلے میں گزشتہ چار دن اسلام آباد میں گزارنے کے بعد مران آج ہی کراچی پہنچا تھا اور سارا دن آرام کرنے کے بعد جب وہ شام میں سو کر اٹھا تو آسمان پر کالے بالوں کا راج تھا۔ ہلکی ہلکی چھوڑ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے موسم کو اس قدر خوشگوار بنا دیا تھا کہ اس کی ساری ممکن ساری سستی لمبوں میں ہوا ہو گئی۔ بے اختیار وہ کھلی کھڑکی میں آکھڑا ہوا اور باجر لان میں دیکھنے لگا جہاں ٹین عمر اور دعا چھوڑ میں بیٹھے اور بیٹھے مسکراتے بھر پور طریقے سے موسم کو انجوائے کر رہے تھے۔ ان ٹینوں کی شوخیاں شرارتیں اور کھلکھلا نہیں اس قدر بے ساختہ اور معصوم تھیں کہ انہیں دیکھتے ہوئے اس کے لب بلا ارادہ مسکرائے اور دل نے بے اختیار ایک خواہش کی جس کے زیر اثر اگلے ہی بل وہ مہاتل پر نیو کا نمبر ملا رہا تھا۔

”ہیلو السلام علیکم“ فوسری طرف نیسو کی آواز
سننے ہی وہ نہایت خوش دلی سے بولا تو نیسو اس کے غیر
معمولی انداز پر حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”و علیکم السلام کیسے ہو؟“

”میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم سناؤ؟“

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ اسلام آباد سے کب
آئے؟“

”آج صبح ہی پہنچا ہوں۔“

”کیسا رہا تمہارا ٹور؟“

”میرے ٹور کو چھوڑو، تم یہ بتاؤ کہ اس وقت کیا
کر رہی ہو؟“

”میرا نئے بے قراری سے پوچھا۔“

”میں۔۔۔ میں فی الحال تو کچھ نہیں کر رہی۔“ مہراں
کے انداز پر غور کرتے ہوئے اس نے جھجک کر جواب
دیا تو دوسری طرف سے وہ فوراً بولا۔

”کچھ نہیں کر رہیں تو پھر قناعت تیار ہو جاؤ، میں
جمہوریت لینے آ رہا ہوں۔“

”مگر کیوں؟“

”واٹ ڈو یو مین بائے کیوں۔ ارے پارا آئی ایم
مسنگ یو۔ اوپر سے موسم بھی اس قدر حسین ہو رہا

ہے۔ تم بس فوراً تیار ہو جاؤ، ہم پہلے لاٹک ڈرا نیچے
چلیں گے اور پھر اس کے بعد ایک شاندار ساؤنڈز کریں

گے۔“ مہراں نے خوشی سے اپنا پلان اس کے گوش
گزار کیا تو نیسو ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

”آئی ایم سوری مہراں، مگر آج میں تمہارے ساتھ
کس نہیں جاسکتی۔“

”کیوں نہیں جاسکتیں؟“ مہراں کے جذبات
پر نیسو کے جواب سے جیسے لوس پڑ گئی تو بے اختیار وہ

جھنجھلا اٹھا۔

”وہ دراصل آج ایک پارٹی کے ساتھ میرا اور پاپا کا
بزنس ڈنر ہے۔ بس اس وجہ۔۔۔“

”بس لو کہ تم جاؤ، جا کر اپنا بزنس ڈنر اینڈ
کرو۔“

”میری سے مہراں نے اسے اپنی بات مکمل نہ

کرنے دی تو نیسو لاجبخت سے گویا بولی۔
”پلیز مہراں، تم ناراض مت ہو۔ ہم ایسا کرتے ہیں
کہ کل شام کارو گرام رکھ لیتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟“

”سوری، کل میں فارغ نہیں ہوں۔“ وہ اپنی انڈیا
بے نیازی سے گویا ہوا۔

”مہراں! پلیز ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔ کیا تم میری
خاطر۔“

نیسو نے کچھ کہنا چاہا تو بھڑک کر اس نے اس کی
بات کٹ ڈالی۔

”تم میری خاطر کامیو ہائز کرنے کو تیار ہو جو میں
کہوں۔“

”گو کہ تم ناراض مت ہو پلیز۔ میں تمہارے
ساتھ چلتی ہوں۔“

نیسو نے مہراں کی ناراضگی کے خیال سے ہتھیار
ڈالتے ہوئے کتا تو وہ رخصت سے بولا۔

”تم اب جانے کو تیار ہو یا نہیں، آئی ڈونٹ کیر
کیونکہ میرا اب باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔“ اور

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی مہراں نے لائن
ڈسکنکٹ کرتے ہوئے موبائل آف کر کے دور

اچھل دیا۔

کافی دیر شوگر لینے کے بعد مہراں جب باہر نکلا تو
طبیعت کو بہت ہلکا محسوس کرتے ہوئے ساجرا لائن میں چلا

آیا، جہاں اب احمر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ چونکہ چھوڑا اب
رک چکی تھی، سو سلام دعا کے بعد وہ دونوں پاس پڑی

لائن چیمیز پر ہی بیٹھ کر کپ شپ کرنے لگے جبکہ وہ
تینوں ایک بیڈ مشین کھیلنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

”تین۔۔۔ ہار مزید ارسی کالی تو پلاؤ۔“ احمر نے
باتوں کے دوران کھیل میں ملن ٹین کو تواز دیتے

ہوئے فرمائش کی تو وہ بد لگائی کے اگلے پھلے تمام ریکارڈ
توڑتے ہوئے بولی۔

”میں کوئی کالی شائی نہیں بناری۔ دیکھ نہیں رہے
کہ میں کھیل رہی ہوں۔“

”بے مروت لڑکی! شرم کو گھر کے مسلمان کے
ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔“

”مسلمان وہ ہوتا ہے جناب جو کبھی کبھار آئے جبکہ تب تو روز ملائے نامکملی کی طرح نازل ہو جانے والے وہیل چلن ہیں۔“
 ”لوں ہوں، شین۔“ مہران نے بے اختیار اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ، جا کر اچھی سی کلفی بنا کر لاؤ۔“
 ”مہائی! میں نہیں بتا رہی۔“ وہ لہنکی تو اب تک خاموش کھڑی دعا ریکٹ ہاتھ سے رکھتے ہوئے بولی۔
 ”میں بتلاتی ہوں۔“

”تم کہیں جا رہی ہو؟ کب سے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں اور اب جب تمہاری باری آئی ہے تو تم نے؟“
 ”میں سب کے لیے کلفی بنا کر بس ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔“ دعا، شین کی بات کالتے ہوئے رسایت سے کہہ کر آگے بڑھ گئی تو امر، شین کو چراتے ہوئے بولا۔

”محترمہ، شین صاحبہ! کچھ شرم کیجیے اور ہماری پیاری دعا سے ہی کچھ سبق سیکھیے جو ہمیشہ دوسروں کی خواہش اور مرضی کو اپنی پسند پر ترجیح دیتی ہے۔“
 ”ہی! تو اس کی بے وقوفی ہے۔“ شین کے لبوں پر ایک رخ مسکراہٹ آن گھڑی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مہران کی پرسوج لکھیں اور جالی پشت پر جرم کر رہ گئیں۔



اتفاق کی کرن کے بیٹے کی آج ہندی تھی اور گھر کی خواتین تھیں کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

”ہی! آپ لوگوں نے جانا بھی ہے یا نہیں؟“ مہران لب کے لالونج میں داخل ہوتے ہوئے غصے سے بولا تو تکی امی جھنجھلا کر گویا ہوئیں۔

”جانا کہیں نہیں ہے مگر یہ لڑکیاں باہر نکلیں تو کچھ ہوتا۔ دعا، شین۔ جلدی کرو۔ بھئی ڈیر ہو رہی ہے۔“ بات کرتے ہوئے انہوں نے آخر میں دونوں کو پکار کر

کساتو مہران کو نقت کے عالم میں صوفے پر بیٹھ گیا۔
 ”آئے ہائے۔ میری عقل۔“ تالی امی نے یک دم ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے خود کو کساتو مہران ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اب کیا ہوا؟“ اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتیں اچانک سائٹ چلی گئی۔
 ”اے لو! اس مصیبت کو بھی ابھی جانا تھا۔ دعا بیٹا۔۔۔“ سائٹ کو کہتے ہوئے انہوں نے دعا کو آواز دی تو وہ کمرے کے اندر سے ہی ذرا اونچی آواز میں بولی۔
 ”جی تالی امی۔“

”بیٹا۔۔۔ ذرا بچن سے موم بتی تو لے آؤ۔“
 ”موم بتی لائی۔“ اور اگلے ہی بل وہ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک موم بتی اٹھائے جو بنی اندھیرے لالونج میں داخل ہوئی مہران کی نظر میں جو بے دھیانی میں اس کی طرف اٹھی تھیں واپس پلٹنا بھول گئیں۔ نہایت خوبصورت انگرکھا اور جوڑی دار پاجامہ زیب تن کیے بانوں میں لمبا سا گھنگھروں والا برائندہ اور کانوں میں پرے پرے بھیکے سنے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ موم بتیوں کی جھلکتی روشنی میں اس کا معصوم چہرہ اس قدر حسین لگ رہا تھا کہ مہران اپنی پلکیں تک جھپکنا بھول گیا۔

”دعا بیٹا۔۔۔ اگر تم تیار ہو چکی ہو تو اوپر میرے کمرے سے جا کر پیک کے ہوئے جوڑے اور گفٹ تو اٹھا لاؤ۔“ تالی امی نے موم بتی کی نڈل اشندہ رنگاتی دعا سے کہا۔ وہ ”جی اچھا“ کہہ کر آگے بڑھنے لگی تو تالی امی پاس بیٹھے مہران سے گویا ہوئیں۔

”بیٹا! تم ذرا دعا کے ساتھ جانا وہ اسیلٹی ہنگی چوس اس اٹھائے گی یا موم بتی۔“ اور مہران نے خود کو سنبھالتے ہوئے خاموشی سے آگے بڑھ کر دعا کے ہاتھ سے جلتی ہوئی موم بتی سلکی۔

تالی امی کے کمرے سے سلمان اٹھا کر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے بیڑھیاں اتر رہے تھے جب اچانک دعا پادری غلط پڑ جانے سے بری طرح لڑکھڑا گئی۔ خود کو اور ہاتھ میں اٹھائے سلمان کو کرنے سے بچانے کے

لیے اس نے بے اختیار ایک قدم آگے چلتے مہران کا بازو تھام لیا تو اسی کے خیال میں تم مہران شاہ کو یک دم اپنے اندر ایک کرنٹ سا دوڑاتا محسوس ہوا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے پلٹ کر دعا سے نرمی سے پوچھا تو اس کے لیے کی اس غیر معمولی نرمی پر غور کیے بنا ٹھہرا کر دعا نے مہران کی آستین چھوڑ دی۔

”آئی۔ آئی ایم سو ری مہران بھائی! چلتے چلتے میرا پاؤں مڑ گیا تھا۔“

”میں لو کے۔“ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر دعا کا بازو تھام لیا دعا نے مضبوط ہاتھ میں لے لیا اور احتیاط سے میڑھیاں اترنے لگا ایک بل کے لیے تو دعا کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے مگر جو نمی اس کی نظر مہران کے ہاتھ میں دسبے اپنے ہاتھ پر پڑی اس کے پاؤں جیسے پتھر کے ہو گئے۔

”خیر ہاتھ چھوڑیں۔“ دعا کے ایک دم رک جانے پر مہران نے جو نمی پلٹ کر دیکھا تو اس نے اپنی قطعیت سے گنا کہ ایک لمحے کو وہ اس کے انداز پر حیران رہ گیا۔ اس سے ہمیشہ گھبرانے اور ڈرنے والی دعا کا یہ روپ مہران شاہ کے لیے بالکل نیا اور چونکا دینے والا تھا۔

”پور اگر میں نہ چھوڑوں تو۔۔۔“ دعا کے انداز پر اس کا زلی غصہ عود کر آیا تو وہ نہایت سرد لہجے میں بولا۔
”تو میں چیخ چیخ کر سب گھر والوں کو اکٹھا کر لوں گی۔“

”تم مجھے چیلنج کر رہی ہو؟“
”نہیں میں آپ کو وارن کر رہی ہوں کہ مجھ سے دوڑ رہیں۔“ اس نے اپنی برف کی طرح ٹھنڈی آنکھیں مہران شاہ کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چمڑا لیا اور تیزی سے دوسرے ہاتھ میں پکڑا سلن نیچے بٹختے ہوئے اس کے ہاتھ سے موم حتیٰ چمین کر اپنے لور شیٹن کے کمرے کی جانب چل دی۔



مہران دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھامے بے بسی کی

کیفیت میں گہرا بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ آج کل اتنا سچ اور جھنجھایا ہوا کہیں رہنے لگا ہے ہر لمحہ طبیعت پر چھائی بے زارنی اور سینہ میں گھٹن کے احساس نے نہ صرف اس کے مزاج بلکہ اس کی صلاحیتوں کو بھی بیسی طرف ہٹا ڈیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان دنوں نہ کسی سے سیدھے منہ بات کرتا تھا اور نہ ہی اپنا کوئی کلمہ صحیح طریقے سے انہماک سے پتلا تھا۔

ایک ماں سمجھ میں آنے والی بے عملی نے اس کی ذات کو کچھ اس طرح سے اپنے حصار میں رکھا تھا کہ وہ چلا کر بھی خود کو اس بھنور سے آزاد نہیں کیا رہا تھا جو آہستہ آہستہ اس کی ساری ہستی کو اپنی پسینہ میں لے رہا تھا۔ نیسو کی ذات سے بھی آج کل اس کی بے اشتیاقی اپنے عروج پر تھی لیکن مہران کی بے رخی کے باوجود وہ اس سے کسی نہ کسی طرح رابطے میں رہنے کی پوری پوری کوشش کرتی اور آج بھی وہ اس ہی طرح اپنی ایک کوشش کے نتیجے میں اس کے آئینہ نشی ہوئی تھی جب مہران نے اسے ایک معمولی سی بات پر برسی طرح جھڑکتے ہوئے اپنا سارا غصہ اس کی ذات پر نکلن دیا۔

”میلے پل تو نیسو اس کے رویے پر گنگہ ہو گئی مگر پھر اگلے ہی لمحے اپنی حد درجہ بے عزتی پر کھل کر رو گئی۔“

”تم۔۔۔ تم خود کو سمجھتے کیا ہو۔۔۔ میں باندی یا کنیز نہیں ہوں تمہاری جو تم ہمیشہ اپنا غصہ مجھ پر نکالتے ہو۔ مہران شاد میں تھک گئی ہوں تمہارے پیچھے بھاگتے بیٹھتے مجھے اپنی زندگی کے لیے ایک ایسے ہم سفر کی چاہ تھی جس کے ساتھ میں قدم سے قدم ملا کر چل سکوں مگر تمہاری ہجرا ہی میں میری یہ خواہش حقیقی بن چلی ہے۔ تم پلیز۔ پلیز اپنے فیصلے پر نظر پٹائی کر لو کیونکہ ابھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔“

دکھ اور تکلیف سے روٹے ہوئے وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی تو مہران اپنا سر تھام کر کرسی پر گر آیا چلا گیا۔ نیسو کے ایک ایک لفظ میں

کی تھی۔



میں ہوں دعا عباس اور آج میری مندی ہے۔
 میری زندگی میں یہ حسین سوڑ جس شخص کی بدولت آیا
 ہے اس کے بارے میں تو میں نے اس انداز سے کبھی
 سوچا ہی نہ تھا مگر بقول اس کے اس نے تو مجھے اپنی منزل
 اس وقت سے مان لیا تھا جب شاید وہ خود بھی خنیت
 کے مغموم سے صحیح طرح آشنا نہ تھا۔ گزرتے وقت
 نے جوں جوں آشنائی کے دور اس کی ذات پر داکے نہ
 صرف اس کے فیصلے میں پختگی آئی کئی بلکہ اپنی محبت کو
 ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کا عزم بھی دن بدن مضبوط ہوتا
 چلا گیا۔ اس محبت کو جسے اس نے سب سے صریح اور
 صرف اس لیے چھپا کر رکھا تھا کیونکہ وہ محبت میں
 صرف چاہنے کا ہی نہیں عزت کرنے کا بھی قائل
 ہے۔

”شہادوس“ میں اب میں صرف ایک دن کی
 مسہان ہوں۔ یہ سوچ اگر ایک ہل کے لیے مجھے دیکھی
 کرتی ہے تو اگلے ہی لمحے ایک نئی اور سہلی زندگی کا
 خیال مجھے مسکرانے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ ایک ایسی
 زندگی جہاں ایک محبت بھرا خوبصورت حل نجانے کب
 سے میرا منظر ہے۔ ”شہادوس“ سے رخصت ہوتے
 ہوئے مجھے کوئی دکھ، کوئی پچھتاوا نہیں۔ میرے اندر
 میرے صحیح اور بروقت فیصلے نے اتنا سکون پیدا کر دیا ہے
 کہ کوئی خلش، کوئی الجھن باقی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ
 میرے جذبات اور میری ذات کی توہین نے جو دکھ اور
 درد کا لالہ میرے اندر روکا رکھا تھا اس آگ پر بھی اب
 جیسے ٹھنڈا پانی پڑ چکا ہے۔ ہاں لیکن میں ایک بات کا
 اعتراف کرتی ہوں کہ اگر وہ ماہ قبل مرزا شہادوس
 پاس نہ آتا تو شاید میں زندگی بھر اس درد اور تکلیف کا
 دکھ جھیلتی رہتی جو اس دیوتاؤں جیسے مغرور اور بے نیاز
 شخص نے مجھ کو دیا تھا۔

یہ آج سے تقریباً دو ماہ پہلے کی بات ہے جب
 اچانک ایک شام مرزا شہادوس میرے کمرے میں چلا آیا۔

چھپی بے بسی نے مرزا شہادوس کو ایک عجیب سے احساس
 جرم میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ باغی ہو گیا تھا کہ غصہ کے
 ساتھ بعض اوقات وہ کس قدر زیادتی کر جاتا ہے مگر اپنی
 ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو ماننے کے باوجود وہ اپنے دل کے
 آگے جیسے ہارنا چلا جا رہا تھا۔ وہ دل جس کے ہر کونے
 میں اچانک ہی دعا عباس آگے سہلی تھی۔
 دل کے اس فیصلے پہ شروع میں تو اس نے بہت
 احتجاج کیا بہت تاویلیں دیں مگر ہر حربہ بے سود رہا۔
 اس کے دل نے نہایت اطمینان سے کسی بے توجہ
 بادشاہ کی طرح اس کی ہر درخواست پر اپیل مسترد کر دی
 اور وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکا۔ قدرت نے اسے
 دعا کے جذبات کی توہین کی ایسی سزا دی تھی کہ اس کا کما
 ہر لفظ ان کی ذات کے لیے آپ ہی ٹھما نچہ بن گیا تھا۔
 وہ تو اس قاتل بھی نہ رہا تھا کہ گھر میں کسی سے اپنا حال
 دل ہی کہہ سکتا اور تنہا اپنے آپ اور اپنے جذبات سے
 لڑتا کس قدر مشکل کام ہے یہ اب مرزا شہادوس سمجھ
 میں بہت اچھے طریقے سے آ جا رہا تھا۔

خود سے لڑتے لڑتے جب وہ نڈھال ہو گیا تو سب
 کچھ بونہی چھوڑ چھاڑ کر آفس سے نکل آیا اور کتنی ہی
 دیر بے مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا اور جب اس
 مصروفیت سے بھی دل سے زار ہونے لگا تو تھک پاپر کر
 گھر چلا آیا، جہاں قدم رکھتے ہی امی نے اپنے سینے
 ایک بہت بڑی خوش خبری اس کے گوش گزار کی۔ اس
 بات سے بے خبر کہ ان کی خوشخبری نے محول میں ان
 کے لاڈلے کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ کئی دنوں سے وہ
 جس کنگش لور الجھن کا شکار تھا اس کا فیصلہ ایک ہی
 جھٹکے میں ہو گیا تھا۔ وہ کیا چاہتا ہے؟ اور اس کے لیے
 کون سا راستہ بہتر ہے گا؟ ان سوالوں کا جواب اسے
 از خود دل گیا تھا کیونکہ اس نے اس حقیقت کے آگے
 سرنگوں کر دیا تھا کہ وہ دعا عباس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور
 دل کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے بعد وہ دل کی ہر
 نصیحت لور ہر تھلکت کو نظر انداز کرتے ہوئے اگلے
 ہی پل دعا کے کمرے میں جا پہنچا۔ اس یقین اور
 بھروسے کے نتیجے کہ کبھی دعا نے بھی اس سے محبت

اور اندازہ دونوں ہی میرے لیے ہر لحاظ سے ناقابل فہم تھے۔

”کیوں؟“ اگلے ہی بل میں نے اپنی الجھن کو لفظوں میں ڈھالا تو چند لمحوں کی پس و پیش کے بعد وہ گویا ہوا۔

”اس لیے کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

اور میں جو اپنے دو حیران میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک لمحے کو جیسے سانس تک لیرا بھول گئی۔ اس کے الفاظ نے مجھے حیرت ’ریشائی‘ دکھ اور بے یقینی ہا ایسا شدید دھچکا لگا کہ ایک لمحے کو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

”دعا تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے تیزی سے بڑھتے ہوئے مجھے سارا رات ایک الجھت ہی میں جیسے ہوش و جواس میں آگئی اور ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے چلائی۔

”خبردار۔۔۔ جو آپ نے مجھے ہاتھ لگایا۔ آپ کی اہم کینے ہوئی مجھ سے یہ سب بکواس کرنے کی۔“

پہلے تک اس دن میں اپنی کسی فریڈ کے گھر گئی ہوئی تھی، سو میں وقت گزارنے کے لیے بونسی ایک کتاب کھولنے بیٹھی تھی۔ جب ایک دم کمرے کے دروازے پر ہوتی دستک کے جواب میں میرے ”ہیس“ کہنے پر جس نے کمرے میں قدم رکھا اس پر نظر پڑتے ہی میرا چہرہ آن واحد میں سپاٹ ہو گیا۔

”میرا بھائی! آپ کو کچھ چاہیے“ بند سے اٹھتے ہوئے میں نے بے تاملیے میں پوچھا تو ایک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے وہ خاموشی سے کمرے میں دھرے کلاؤج پر جا بیٹھا۔

”دعا تم جیسو مجھے تم سے ایک سمت ہی ضروری بات کرنی ہے۔“ کمرے میں چھائی خاموشی کو میرا کی آواز نے توڑا تو میں جیسے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

”مکرم میرا شاہ کو کوئی ضروری بات کرنی ہے اور وہ بھی مجھ سے ہے۔“ یہ انمولی میرے لیے خاصے اچھے کا باعث تھی جس پر غور کرتے ہوئے میں بیڈ کے کنارے پر ہی ٹنگ گئی۔

”کیسے“ میں اس کے بولنے کی سنکر تھی مگر کچھ دیر گزارنے کے بعد بھی جب وہ خاموش رہا تو مجبوراً مجھے متوجہ کرنا ہی پڑا۔

”دعا! تمہیں پتا ہے کہ آج عائشہ پھپھو تمہارے لیے امر کارشتہ لے کر آئی ہیں۔“ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے ایک ایسی بات کہی جس کا ذکر وہ بھی اس کے منہ سے مجھے حیرت کا وہ سرا شدید جھٹکا دینے کے لیے کافی تھا۔

”جی مجھے معلوم ہے۔“ چند لمحے خود پر قابو پانے کے بعد میں نے آہستگی سے جواب دیا تو میری بات پر وہ بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”جی نہیں۔“

”مگر مجھے ہے۔“ اب کے وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا تیزی سے بولا تو میں اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا رویہ

زی ٹی وی کا مشہور پروگرام

کہا نا خزانہ

نیا ایڈیشن

سنجیو کپور

خوبصورت تصاویر کے ساتھ

حسین و خوبصورت گیٹ اپ

قیمت صرف = 250 روپے

لئے کاہا:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی

تو میری بات سمجھ کر وہ بے قراری سے بولا۔
 ”میسو کو میں سمجھا لوں گا ویسے بھی اس بات کا
 احساس اسے بھی ہو چلا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے
 کے لیے موزوں نہیں۔“

”آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے موزوں ہیں یا
 نہیں، یہ میں نہیں جانتی۔ ہاں مگر میں اتنا ضرور جانتی
 ہوں کہ آپ میرے لیے قطعی ناموزوں ہیں اور ویسے
 بھی مجھے دوسروں کے دل اجاڑ کر اپنا دل بسانا نہیں
 آتا۔ سو پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں اور آئندہ کبھی
 میری راہ میں آنے کی کوشش نہ کیجیے گا کہ اب میرے
 دل میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ محبت نہ
 نظرت۔ حتیٰ کہ جو تھوڑی بہت عزت رہ گئی تھی آج وہ
 بھی ختم ہو گئی۔“ دگر فکری سے میں نے اپنی بات
 پوری کرتے ہوئے ایک نظر مران شاہ کو دکھایا تو اس کا
 پورا وجود مجھے زلزلوں کی زد میں محسوس ہوا۔ شاید ہمیشہ
 جتنے دالے جب فلکست سے دوچار ہوتے ہیں تو ان کی
 وہی حالت ہوتی ہوگی جو اس وقت مران شاہ کی تھی۔

کسی بارے ہوئے کھلاڑی کی طرح وہ اگلے چند لمحوں
 یونہی گم گم کھڑا ہوا اور پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ
 پلٹا اور نہایت شکستگی کے عالم میں چلتا ہوا دروازے
 تک پہنچ گیا مگر پلیز بار کرنے سے پہلے اس نے گردن
 موڑ کر میری جانب دیکھا اور اس بل زندگی میں پہلی بار
 میں نے اس بے نیاز اور مضبور آنکھوں میں اپنے لیے
 وہی بے قراری وہی تڑپ دیکھی جس کی میں نے کبھی
 تمنا کی تھی مگر میں اب ان ساحر اور گہری آنکھوں کے
 لیے کچھ نہ کر سکتی تھی کیونکہ میں اپنی جگہ مجبور تھی
 بے حد مجبور۔ اپنی اس لولوہو عزت نفس کے ہاتھوں
 جس نے محبت اور عزت کی اس جنگ میں اپنے لیے
 عزت کا انتخاب کیا تھا اور اپنے اس زخمی دل کے
 ہاتھوں جس نے حقیقتاً ”آپ نام نہ بدل دیے تھے۔“

میں اٹھ کر اس کے مقابل آگہری ہوئی۔ اس کی بات
 نے مبر اور خاموشی کے بند کو جیسے توڑ ڈالا تھا۔ میرا بس
 نہیں چل رہا تھا کہ میں سامنے کھڑے مران شاہ کو
 شوٹ کر دوں۔

”وہا۔ پلیز تم۔ تم میری بات نہ۔“
 ”بات تو آپ میری سیں مسٹر مران شاہ! چلاتے
 ہوئے میں نے اس کی بات کلت وی تو میرے انداز پر
 حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ
 گئیں۔“

”آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ ان دنوں؟ جب چاہا نواز
 دیا اور جب چاہا ٹھکرا دیا۔ میں آج۔۔۔ آج بھی وہی تھوڑا
 کھٹاس میروں ہوں جس کی عامیانا باتوں کو سلوٹ مارنا
 آپ اپنی تو جن سمجھتے تھے جس کی طبیعت صاف کر کے
 اس کے دماغ سے عشق و عاشقی کا خناس نکالنے کے
 لیے آپ بہت بے چین تھے۔ آپ۔۔۔“ غصے کی
 شدت سے میں ہانپنے لگی تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے
 نہایت شرمندگی سے بولا۔

”وہا! میں نہیں جانتا کہ تمہیں یہ سب باتیں کیسے
 پتا چلیں۔ میں مانتا ہوں کہ انجانے میں ہی سہی مگر میں
 نے تمہیں بہت دکھ بہت تکلیف پہنچائی ہے اور اس
 کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔ تم پلیز نہ
 پلیز مجھے معاف کر دو یہ سوچ کر کہ تب میں محبت جیسے
 پاکیزہ جذبے سے واقف نہ تھا مگر آج۔۔۔“
 ”مگر آج میں اس جذبے سے واقف نہیں رہی۔“

میں نے اس کی بات عمل ہوتے سے پہلے ہی ایک
 جملے میں اسے اپنا جواب دے دیا تو دکھ کے گہرے
 سائے مجھے اس کے چہرے پر پھیلنے محسوس ہوئے۔ پتا
 نہیں لیکن اس لمحے میرے اندر جو آگ سی بھڑک رہی
 تھی اس پر مجھے پھواری پڑتی محسوس ہوئی۔

”جھانسی ہوا کہ آپ جیسے کمزور شخص سے میرے
 خدا نے مجھے بچا لیا جسے نہ پہلے کبھی دوسروں کا خیال آیا
 تھا اور نہ ہی آج اپنے فیصلوں پر قائم رہنا آیا۔ سب آپ
 کو تو اتنا بھی احساس نہیں کہ آپ کسی سے منسلک
 ہو چکے ہیں۔“ میں نے تاسف سے اسے احساس دلایا